برگِ نوخیز

علی آصف

Barg - e - Nau Khez

Poetry: By Ali Asif

Farah Publications, Sheikhupu

نام کتاب: برگِ نَوخیز

شاعر : علی آصفؔ

ای میل:aliasif736@gmail.com

سنِ اشاعت: 2012 (بارِاوّل)

کمپوزنگ : اشرفؔ نقوی،شیخوپورہ 0345-6352439

اہتمام : اصغر علی جاویدؔ0334-4005060

قیمت : -/150 روپے

فرح پبلیکیشنز متّصل فاطمہ میموریل سکول، طارق روڈ شیخوپورہ

اِنتساب

مسیحانِ عصر کے نام

اِس دَور کی ظلمت سے
اِنکار نہیں مجھ کو
اِس رات کے چہرے پر
ہر رات کا سایا ہے
اِس رات کی قسمت میں
ہیں چاند بھی دو لیکن
اِک چاند تو مہدیؑ ہے
اور دُوسرا عیسٰیؑ ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

برگِ نوخیز

علی آصفؔ

حُسنِ ترتیب

اظہارِ تشکّر

پروفیسر نوید احمد گِل، جناب نذیر قیصر،
جناب اصغر علی جاوید، پروفیسر خُرم عباس وِرک
ارشد نعیم، اشرف نقوی
قیصر اقبال

پہلا حرف

شاعری کی کسی نئی کتاب پر لکھنا، نئی شاعری پر اظہارِ خیال کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ تمام فنون اپنے عصر سے جڑے ہوتے ہیں۔ اور اُسی روحِ عصر کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ غالبؔ ،اقبالؔ ،فیض، راشد اور ناصر کاظمی سے منیر نیازی، شہزاد احمد اور ظفر اقبال تک، نئی شاعری پر بات کرنے والوں کا سفر رُکا رُکا سا ہے۔ اُس رُکے ہوئے سفر میں ظفر اقبال اکیلے مسافر ہیں جو آگے بھی بڑھ رہے ہیں اور اپنے آگے پیچھے چلنے والوں کی خبر بھی دیتے ہیں۔

گزشتہ نصف صدی میں نئی شاعری کا سفرنامہ غیر محسوس طریقے سے بہت حد تک بدل چکا ہے۔ جیلانی کامران، انیس ناگی، احمد ہمیش، سید افضال احمد، رفیق سندیلوی، عبدالرشید، اظہار الحق، ابرار احمد، کاشف حسین غائرؔ، علی محمد فرشیؔ اور سعود عثمانی سے شاہین عباس تک موضوعات اور اُسلوب کی ایک نئی دھنک جھلملاتی ہے۔

نئی شاعری خدا کی طرح ہونے اور نہ ہونے کے درمیان دُھند کی طرح بکھری ہوئی ہے۔ جس میں صورتیں آپ تک براہِ راست نہیں پہنچتیں۔

آپ کو اِس دُھند میں داخل ہو کر آہستہ آہستہ اِن صورتوں تک پہنچنا ہوتا ہے۔ ڈوبے ہوئے چاند اور خزاں آثار باغ کے کنارے وارث شاہ کے حُجرے میں ایک چراغ روشن ہوا ہے۔ اِس ٹھنڈی میٹھی لو والے چراغ کا نام علی آصف ہے۔ جن دنوں میں ڈوبے ہوئے چاند اور خزاں آثار باغ یعنی چاند باغ میں رہا کرتا تھا، اُن دنوں علی آصف اکثر مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ادب، فلسفہ، مذہب اور اِس طرح کے کئی موضوعات پر تبادلۂ خیال رہتا تھا۔ اُن دنوں بھی علی آصف میں ایک تڑپ، ایک جستجو اور چیزوں کو سمجھنے کی شدید آرزو تھی اور آج بھی ہے۔

شیخوپورہ کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ جس کا نام سیکھم ہے۔ اور یہ نام اپنے صوری اور

صوتی حوالے سے ہمیشہ مجھے متأثر کرتا رہا ہے۔علی آصف اِسی قصبے کے ایک چھوٹے سے گاؤں خوشحال پورہ میں رہ رہے ہیں۔خوشحال پورہ جو ایک چھوٹا سا گاؤں ہے کسی دن علی آصف کے نام کی نسبت سے بڑا بھی ہوسکتا ہے۔میں نے کہیں لکھا تھا بڑے شہروں کا ادب تیز بارشوں کی طرح ہوتا ہے۔چیزوں کو اِدھر اُدھر بہاتا ہوا، سیراب کرتا ہوا، خراب کرتا ہوا۔مگر چھوٹے شہروں کا ادب ہلکی بارشوں جیسا ہوتا ہے۔بونداباندی سی، کچے گھروں سے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اُڑاتی ہوئی اور اپنے ماحول کو مہکاتی ہوئی۔اور یہی مہک ایک چھوٹے شہر سے بڑے شہر میں آکر فیض کہلاتی ہے۔مجید امجد، ظفر اقبال، انتظار حسین، ارشد محمود اور وزیر آغا کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔

لاہور، کراچی، راولپنڈی کے بعد اچھا لکھنے والوں کی وجہ سے سرگودھا، فیصل آباد بھی ایک اعلیٰ ادبی مکتبۂ فکر کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔اور ان ہی صفات کی بناء پر ہم شیخوپورہ کو بھی اِسی فہرست میں شامل کر سکتے ہیں کہ یہاں پر اشفاق ورک، ارشد نعیم، اصغر علی جاوید، شاہین عباس ،اشرف نقوی، اکرم سعید اور اظہر عباس جیسی تخلیقی شخصیات موجود ہیں۔اور میں تو گوجرہ جیسے چھوٹے شہر کو بھی سیّد اذلان شاہ، شکیل سروش اور میاں عامر محمود کے تخلیقی کام کی وجہ سے مکتبۂ فکر کا نام دیتا ہوں۔اور شیخوپورہ کے حوالے سے علی آصف بھی اِس فہرست میں شامل ہوتے ہیں۔جیسا کہ میں نے شروع میں کہا کہ وہ وارث شاہ کی اقلیمِ سُخن کے حُجرے کا روشن چراغ ہیں۔مگر وہ خود کو جلتے ہوئے خیمے کا چراغ کہتے ہیں۔

میں ہوں جلتے ہوئے خیمے کا چراغ
میرے پہلو میں رواں ہے دریا
آگ لپٹی ہے خیمۂ دل سے
اور بجھانے کو جی نہیں کرتا

علی آصف کی شاعری میں جلتے ہوئے خیمے اور اُن کے پہلو میں بہتی ہوئی فرات کا ذکر ایک شہادت کی زندہ روایت کے ساتھ ساتھ اپنے عصر کا المیہ بھی بیان کرتا ہے۔آج بھی خیمے میں چراغ جلتا اور بجھتا ہے اور رفیقِ سفر آنکھوں کے حجاب میں ڈوبتے اور اُبھرتے ہوئے شہادت کے منظر نامے میں غائب اور ظاہر ہوتے ہیں۔

شاخ پر کِھلا تھا میں
شاخ پر بکھر گیا

شاخ پر کِھلنے والے معصوم پھول دیکھنے والوں سے دور شاخ پر بکھر جاتے ہیں۔خاموشی کے جبر کا یہ موسم سانس روکے ہوئے اپنے گل بُوٹے سنّاٹے کی آگ میں جھونکتا چلا جاتا ہے۔حدیثِ مبارک ہے۔

''جبر کے موسم میں پرندے بھی
اپنے گھونسلوں میں مر جاتے ہیں''

یہ جبر کا موسم آج ہمارے اندر بھی مسلط ہے اور باہر بھی۔ہم اپنے ہی ہاتھوں بجھائے ہوئے چراغوں کے دُھویں میں سانس لے رہے ہیں۔

علی آصف کی شاعری اِس جبر کا انکار کرتی ہے اور زندگی کا اقرار کرتی ہے۔شاعر زندگی اور زندگی کی خوبصورتی کا اقرار کرتا ہے اور اِسے مزید خوبصورت بنانے کی کوشش کرتا ہے۔
ہمارے معاشرے میں ایک خوبصورت پینٹنگ بنانا، ایک خوبصورت نغمہ تخلیق کرنا، ایک اعلیٰ شعر کہنا عبادت ہے، کیوں کہ آرٹس انسان کے باطن کو خوبصورت بناتا ہے۔علی آصف کی شاعری اپنے چھوٹے سے گاؤں خوشحال پورہ سے نکل کر ہمارے آسمانوں کو نئے رنگ اور نئی صورتیں دینے کے لیے آرزوئے خیر کی طرح بیتاب ہے۔امید ہے کہ اِس آہستہ رَو مگر تیز قدم مسافر کے لیے سکندر کی طرح کہا جائے گا

''وہ آیا اُس نے دیکھا اور اُس نے فتح کر لیا''

غالب نے رنگِ بیدل میں لکھنا شروع کیا تھا اور آخری عمر میں اپنا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ علی آصف نے غالب کے رنگ میں ابتداء کی ہے مگر ہمیں امید ہے کہ وہ اپنی آخری عمر سے پہلے رنگِ غالب سے آزاد ہو جائیں گے۔

دیکھنا یہ ہے کہ اب شوق مِرا
دوسرا پاؤں کہاں رکھتا ہے

دوسرا پاؤں رکھنے کے لیے بہت سی نئی سرزمینیں علی آصف کی منتظر ہیں اور ہم بھی۔ اب ہمیں بھی دیکھنا ہے کہ علی آصف کا دوسرا پاؤں کہاں پڑتا ہے؟۔

نذیر قیصر

فطرت اسیرِ لذتِ کون و فساد ہے
ذرّہ جو بے ستوں کا ہے سنگِ نہاد ہے

ہستی سے دور ہوں میں، عدم سے قریب ہوں
جو تھا، نہیں وہ یاد، نہیں جو، وہ یاد ہے

واعظ کی لب کشائی تھی جنت کے باب میں
مجنوں یہ پوچھتا تھا کہ ’’صحرا مراد ہے‘‘؟

یا رب ! کوئی تو نقش یہاں دیرپا ملے
نا خوش ہے زندگی یہ ازل سے ، نہ شاد ہے

دریا نگاہ میں ہے ، نہ آصفؔ ہے دشت ہی
ساماں بہ سَیلِ آب تو خیمہ بَہ باد ہے

شُعلۂ کُن سے جلا کر مجھ کو
چُھپ گئے آپ جگا کر مجھ کو

مطمئن میرا مصوّر نہ ہوا
بارِ دیگر بھی بنا کر مجھ کو

تُو نے زخموں پہ نمک چھڑکا ہے
مُژدۂ خُلد سنا کر مجھ کو

ہے اَنا سنگِ رہِ شوق ابھی
روٹھ جاتا ہے منا کر مجھ کو

نوحہ لکھنے کو ہے بے تاب ہوا
کفِ صحرا سے مٹا کر مجھ کو

گردِ صحرائے جُنوں ہوں آصفؔ
قیس ہنستا ہے اُڑا کر مجھ کو

کب سے اِس شہرِ بدقماش میں ہوں
ایک انسان کی تلاش میں ہوں

ماہِ نو خیز ہوں کہ انجمِ صبح
نبضِ ہستی کے اِرتعاش میں ہوں

بند آنکھوں سے خانۂ دل میں
اِک اَلکھ پُرش کی تلاش میں ہوں

کیا خبر، کیا ہوں؟ مُنتظر ہوں ابھی
سنگ ہوں، دستِ بُت تراش میں ہوں

وجہِ تنزیلِ رِزق ہوں آصفؔ
پھر بھی اندیشۂ معاش میں ہوں

ہم نے یہ غم جو پال رکھا ہے
بس اِسی نے سنبھال رکھا ہے

ایک اِتنا سا دل ہے اور اِس نے
کیسی مشکل میں ڈال رکھا ہے

کیوں بُرا مانئیے پئے صیّاد
اُس نے کچھ دن خیال رکھا ہے

زندگی کیا ہے ؟ پوچھ لے ، ہم نے
یہ سمندر کھنگال رکھا ہے

زندگی کیا ہے چار سانسوں کا
طوق گردن میں ڈال رکھا ہے

مُجھ کو میرے حُسینؑ نے آصفؔ
مثلِ تازہ نِہال رکھا ہے

زندگی کربِ آگہی میں رہی
راز کی بات راز ہی میں رہی

شوق اِک دشتِ نو میں جا نکلا
قبر میری اُسی گلی میں رہی

شوق کافر ، فنا سے اُلجھا رہا
طبعِ ایجاد آزری میں رہی

محملِ مرگ جُز خیال نہ تھا
زندگی دشتِ زندگی میں رہی

میری صد سالہ زندگی آصفؔ
ایک لمحے کی ساحری میں رہی

غم مِرا لا علاج ہے اور بس!
یہ تسلّی رواج ہے ، اور بس!

پوچھتے ہیں کہ زندگی کیا ہے ؟
ایک بارِ خِراج ہے ، اور بس!

رَفت و فردا نہیں بجُز پِندار
سچ تو یہ ہے کہ "آج" ہے اور بس!

دعوتِ شوق کس کو دیں ؟ کہ یہاں
زندگی کام کاج ہے ، اور بس!

عِشق ہے جذب و مستیِ آصفؔ
عقل ہُد ہُد مزاج ہے اور بس!

موجۂ وہم و گماں ہے دریا
غور سے دیکھ ، کہاں ہے دریا

میں ہوں جلتے ہوئے خیمے کا چراغ
میرے پہلو میں رواں ہے دریا

ایک مُدّت کی کشاکش کے بعد
تھک گئی پیاس ، جواں ہے دریا

موج بیتاب ہے در شکلِ سراب
دشت کی تہ میں رواں ہے دریا

اوک سے بہہ کی کِسی کی آصفؔ
آج تک محوِ فُغاں ہے دریا

آرزوئے وِصال جاتی رہی
یادِ چشمِ غزال جاتی رہی

ناتمامی کا درد جاتا رہا
جُستجوئے کمال جاتی رہی

خبط سود و زیاں کا باقی نہیں
فکرِ اَوج و زوال جاتی رہی

وقت ٹھہرا ہوا ہے دل کی طرح
گردشِ ماہ و سال جاتی رہی

موت لائی ہے اب لحد میں مجھے
حسرتِ قیل و قال جاتی رہی

مائلِ شِکوہ دل نہیں آصفؔ
اور دُعا کی مَجال جاتی رہی

دُکھ سُنانے کو جی نہیں کرتا
دل دِکھانے کو جی نہیں کرتا

آگ لپٹی ہے خیمۂ دل سے
اور بُجھانے کو جی نہیں کرتا

خوف غارت گرِ تمنّا ہے
گھر بنانے کو جی نہیں کرتا

یہ جہاں کیا ہے اور خدا کیا ہے؟
سر کھپانے کو جی نہیں کرتا

کون کتنا ہے جاں نثار اپنا
آزمانے کو جی نہیں کرتا

کٹ چکی ہیں تمام زنجیریں
بھاگ جانے کو جی نہیں کرتا

اب تو اِن زخموں پر مِرا آصفؔ
کچھ لگانے کو جی نہیں کرتا

دید کا ہُنر گیا
جادوئے نظر گیا

رت جگے نہیں رہے
ماتمِ سحر گیا

بال اُس کے کھل گئے
پھول اِک بکھر گیا

عندلیبِ باغ تھا
جنگلوں میں مر گیا

زندگی کی دَوڑ تھی
دوڑنے سے ڈَر گیا

شاخ پر کِھلا تھا میں
شاخ پر بکھر گیا

زندگی کا جام تو
زندگی سے بھر گیا

ہے گلی وہی مگر
گھر مِرا کِدھر گیا

آصفِ شِکستہ پا
قافِلہ گُزر گیا

اپنی ہستی خیال و خواب نہیں
دشتِ اِمکاں میں کچھ سراب نہیں

کسرِ شانِ خِرد نہیں ہمدم
یہ اگر داخلِ حجاب نہیں

رونقِ کعبہ کھینچ لائی ہے
اِس میں کچھ نیّتِ ثواب نہیں

آہوئے ماندۂ گشا گش ہوں
آرزوئے سکونِ غاب نہیں

تحفۂ نخل ہے یہ جنّت کو
حاجتِ مستیٔ شراب نہیں

اہلِ مَسند ہیں مانعِ مِلّت
ورنہ مذہب تو قفلِ باب نہیں

مُند گئی میری چشمِ وا آصفؔ
حُسن آمادۂ حجاب نہیں

شہیدِ ذوقِ سفر ہوں ، سفر میں رہتا ہوں
میں ایک اشک ہوں اور چشمِ تر میں رہتا ہوں

عجب اُداسی مسلط ہوئی ہے اِس دل پہ
کوئی خوشی کا بھی دن ہو تو گھر میں رہتا ہوں

ذرا سا غم بھی اگر چُھو لے دامنِ دل کو
میں کتنے سال اُسی کے اثر میں رہتا ہوں

خیالِ مرگ سے بیگانہ کیسے ہو جاؤں؟
چراغِ شب ہوں ، خیالِ سحر میں رہتا ہوں

تو بے نیاز جہاں چاہے خیمہ زن ہو جائے
میں مُنتظر سو تِری رہگزر میں رہتا ہوں

مِرا عذاب فقط ہے مِرے لیے ہمدم
میں دردِ سَر ہوں اور اپنے ہی سَر میں رہتا ہوں

میں نقشِ خار سہی زیرِ مُو قلم آصفؔ
خوشا کہ صاحبِ کُن کی نظر میں رہتا ہوں

وہ جو اِس دل میں مکاں رکھتا ہے
دیکھیئے ، ہم کو کہاں رکھتا ہے

عشق مختارِ تبدّل ہو اگر
چاند بھی آبِ رواں رکھتا ہے

دیکھنا یہ ہے کہ اب شوق مِرا
دوسرا پاؤں کہاں رکھتا ہے

ہے تو ابلیس ، مگر ہر لحظہ
دلِ ہستی کو جواں رکھتا ہے

حوصلے دیکھ خدا کے آصفؔ
آپ ہر مُنہ میں زباں رکھتا ہے

امتحاں ہے، عذاب ہے، کیا ہے؟
چھیڑ ہے یا حساب ہے، کیا ہے؟

آگ ہے یا چراغ کی لَو ہے
یہ دُھواں ہے، سحاب ہے، کیا ہے؟

کھو رہے ہیں کہ مل رہے ہیں کہیں؟
پی رہے ہیں شراب ہے، کیا ہے؟

گر کہو کہ گناہ ہے ، کیوں ہے ؟
گر کہو کہ ثواب ہے ، کیا ہے

مختصر سا سوال ، کیا ہے خدا؟
مختصر سا جواب ہے ، کیا ہے ؟

نعرۂ دوست ’’ لن ترانی ‘‘ ہے
اور عدو بھی حجاب ہے ، کیا ہے؟

کوئی آصفؔ سوال کیا پوچھے؟
جب تمہارا جواب ہے ، کیا ہے ؟

یہ جو اِک قوّتِ اِرادہ ہے
حرمِ زِیست کا لِبادہ ہے

عُمر چھوٹی ہے ، تجربہ کم ہے
اور سفر خضرؑ سے بھی زیادہ ہے

غمِ منزل ہے لُقمۂ حیرت
رہگُزر ہے نہ کوئی جادہ ہے

اے رہِ شوق مُعجزے تیرے
برق بھی آج تو پیادہ ہے

خیر و شر کی لڑائی کو آصفؔ
صحنِ دل کِس قدر کُشادہ ہے!

طالعِ شوق کیوں زوال میں ہے؟
یہ کہ اندیشۂ وصال میں ہے

خُود نمائی کا شوق پورا ہوا
اے خُدا اب تو کس خیال میں ہے؟

کل جو محمل نشیں تھی لیلیٰ ٔ جاں
اِن دِنوں خیمۂ ملال میں ہے

حضرتِ نطشے ؟ کیا کہیں ہمدم
ایک وحشی ہے اور جلال میں ہے

فکرِ دُنیا وبال ہے آصفؔ
اور مزا بھی اِسی وَبال میں ہے

حسرتِ وصل رو گئی مجھ کو
جاتے جاتے ڈبو گئی مجھ کو

نقشِ دیوارِ ضبطِ اُلفت ہوں
پہلی بارش ہی دھو گئی مجھ کو

لے تو نکلی تھی جَستجو تیری
دشتِ حیرت میں کھو گئی مجھ کو

کِس قدر جلد تم سے ملنا تھا
کِس قدر دیر ہو گئی مجھ کو

آخرِ شب کی نیند تھا آصفؔ
زندگی کب کی سو گئی مجھ کو

نیند کے بَن میں کھو رہا ہے کوئی
خواب میں خواب ہو رہا ہے کوئی

کِس کی پلکیں ہوئی ہیں سایہِ فِگن؟
میرے چہرے کو دھو رہا ہے کوئی

سرِ ساحل پکارتا ہے کون
زندگی کو ڈبو رہا ہے کوئی

بے نیازی ہے یا شکایت ہے
تپتے صحرا میں سو رہا ہے کوئی

ایسا لگتا ہے اِن دِنوں آصفؔ
میرے پہلو میں رو رہا ہے کوئی

تمہی دیتے تھے پھر صدا مجھ کو
میں تو کہتا تھا بھول جا مجھ کو

میں ہی اِک پھول شاخ پر تھا کِھلا
چھوڑتی کس لیے ہوا مجھ کو ؟

اِک سمندر کا میں جزیرہ تھا
اور سمندر ہی کھا گیا مجھ کو

دشت میں چاند ڈھونڈتا ہے مجھے
گھر میں روتا ہے اِک دِیا مُجھ کو

نہیں بولوں گا حشر میں آصفؔ
مِلنے آئے گا جب خُدا مُجھ کو

تُو نے دیکھا ہے کِس نظر سے مجھے
ہاتھ دھونا پڑے جگر سے مجھے

دِل سُوئے خانہ کیوں نہیں کھنچتا
دُور رکھتا ہے کون گھر سے مجھے

دُھوپ تک مُجھ سے دُور رہتی ہے
سایہ مِلتا نہیں شجر سے مجھے

کوئی چہرہ نظر نہیں آتا
آ رہی ہے صدا کِدھر سے مجھے

میں کِسی سے ذرا نہیں ڈرتا
خوف آتا ہے اپنے ڈر سے مجھے

کی تو اِک شخص نے جفا مُجھ سے
اور گِلہ ہے جہان بھر سے مجھے

اِک سفر ہے یہ زندگی آصفؔ
اور مِلا کیا ہے اِس سفر سے مجھے

مُسکرایا نہیں ، ہنسا بھی نہیں
آج تو چھت پہ وہ رُکا بھی نہیں

اب مَیں اِس واقعے سے کیا سمجھوں؟
گھر میں آیا تھا اور مِلا بھی نہیں

میں دُعاؤں میں مانگتا ہوں اُسے
جس سے اُمیدِ بد دُعا بھی نہیں

بس محبت اِسی کو کہتے ہیں
دُور ہے مجھ سے اور جُدا بھی نہیں

جاں ابھی سے روانہ ہوتی ہے
وہ ابھی شہر سے گیا بھی نہیں

دُشمنِ جاں ہے عِشق سُنتے ہیں
اِس سے لیکن کوئی بچا بھی نہیں

میری جنت بھی آکے دیکھ کبھی
اور پھر دیکھ میں خُدا بھی نہیں

ہَوَسِ دید رُوبرو چاہے
پھول جو شاخ پر کِھلا بھی نہیں

اِس خرابے میں اِک نظر دیکھو
اور ہے کیا ؟ اگر خدا بھی نہیں

یہ جہاں اِک حباب ہے آصفؔ
جس میں اپنے لیے ہوا بھی نہیں

ذَوقِ آوارگی نہیں رکھتا
دل تِرا زندگی نہیں رکھتا

اِنتہا سادگی کی ہے اُس پر
حُسن جو سادگی نہیں رکھتا

کیا ہے ، معمارِ گُنبدِ افلاک !
خِشت کیوں آخری نہیں رکھتا

ہے نِکمّوں کی یہ اُڑائی ہوئی
چاند رُوئیدگی نہیں رکھتا

پوچھ لیتے ہیں اُس سے آج آصفؔ
کیوں خبر آپ کی نہیں رکھتا

جُز اب اِس کے ، خیال کیا ہوگا
بِن تِرے میرا حال کیا ہوگا

چشمِ بد دُور سُرعتِ دَوراں
ہمیں جینا محال کیا ہوگا

جس کی تنہائی ’’ یُوسفی‘‘ رکھے
اُس کی محفل کا حال کیا ہوگا

ہمیں اپنی مثال مِلتی نہیں
کوئی تیری مثال کیا ہوگا

ٹل ہی جائے گی وہ مُصیبت بھی
کچھ تو خود کو سنبھال ، کیا ہوگا

لُطف آئے گا حشر میں آصفؔ
قبر میں قِیل و قال کیا ہوگا

اِک نئے وہم سے ڈر جاتا ہوں
چلتے چلتے میں ٹھہر جاتا ہوں

جمع کرتے ہیں زمانے مُجھ کو
اور میں لمحوں میں بکھر جاتا ہوں

رات تاروں میں بسر ہوتی ہے
صبح ہوتی ہے تو مر جاتا ہوں

جانتا ہوں کہ وہاں کیا ہوگا
اے مِرے شوق ! مگر جاتا ہوں

روز ِگرتا ہوں نظر سے اُس کی
روز اِک دل میں اُتر جاتا ہوں

سر خُوشی ہو کہ پریشانی ہو
راہ مِلتے ہی گُزر جاتا ہوں

میں تو بے خود ہوں مگر تُم آصفؔ
دیکھتے رہنا ، کِدھر جاتا ہوں

کب یہاں فرقِ کوہ و کاہ نہ تھا؟
عِشق کِس دور میں گناہ نہ تھا؟

وصل ، اور لیلٰی تشنہ کام رہے
خیمہ اُس کا یونہی سیاہ نہ تھا

رشکِ نرگس تو چشمِ حُور بھی تھی
وہ مگر شُعلۂ نگاہ نہ تھا

کج خیالی ہے رونقِ محراب
ورنہ مذہب تو سدِّ راہ نہ تھا

وہ جو آدمؑ سے ہو گیا آصفؔ
ایک سازش ہوئی، گناہ نہ تھا

مائلِ کوئے بُتاں رہتا ہے
دِل مِرے پاس کہاں رہتا ہے؟

اُس کے ہونے کا یقیں ہے لیکن
اِک نہ ہونے کا گُماں رہتا ہے

اِن دو آنکھوں سے تلافی کیا ہو؟
سامنے رہ کے نِہاں رہتا ہے

عرش کا نام نہ لو دل کے حضور
جانتے ہیں کہ وہاں رہتا ہے

خُطبۂ قیس پہ انجام نہیں
ایک نوخیز جواں رہتا ہے

بزمِ اُلفت کے چراغوں کی ہو خیر
خانۂ دل میں دُھواں رہتا ہے

خوف اِک دل پہ مُسلّط ہے مِرے
سر پہ اِک بارِ گراں رہتا ہے

سامنے دل کا مکاں جلتا ہے
آنکھ میں سَیلِ رواں رہتا ہے

دوپہر ہو کہ سحر ہو آصفؔ
دِل یہ سرگرمِ فُغاں رہتا ہے

دل یہ ہر وقت ڈرا رہتا ہے
کچھ نہ کچھ روز ہُوا رہتا ہے

دل میں زخموں کے سِوا کچھ بھی نہیں
ایسی جگہوں پہ خُدا رہتا ہے؟

مجھ کو معلوم نہیں ، دل میرا
کیوں زمانے سے جُدا رہتا ہے

کون خوش بخت ہے وہ جس کے لیے؟
تیرا دروازہ کُھلا رہتا ہے

میں نے اُن ہونٹوں پہ جب بھی دیکھا
پھول اِک جیسے کِھلا رہتا ہے

تیری آنکھوں میں بتا کیوں آصفؔ؟
خون پانی میں مِلا رہتا ہے

حسرتِ لا مکاں میں کیوں رکھا؟
خیمہ گاہِ جہاں میں کیوں رکھا؟

مجھ کو پیوندِ خاک رکھنا تھا
اپنا گھر آسماں میں کیوں رکھا؟

یہ تو سمجھاؤ کہ فنا کا دُھواں
شُعلۂ کُن فکاں میں کیوں رکھا؟

یہ تو طے ہے کہ تُو حقیقت ہے
مجھ کو وہم و گُماں میں کیوں رکھا؟

کیا ہے تفسیرِ آیۂ یُوحٰی؟
نامہ بر درمیاں میں کیوں رکھا؟

آ کے اب صبر کو دوا جانا
وہ بھی جب دل نہیں رہا ، جانا

عشق سودائیِ ’’ ورا ‘‘ دیکھا
عقل کو مُنکرِ ’’ ورا ‘‘ جانا

مِصر بھر میں بس اِک زُلیخا نے
حُسن کو مُعجزہ نُما جانا

بات سیدھی سی تھی مگر ہمدم
ہم نے کیا اور تُم نے کیا جانا؟

اُس کی منزِل مُحال ہے آصفؔ
جس نے سُورج کو واسطہ جانا

کُچھ کہی اور سُنی یاد نہیں
بات کیا کیا تھی ہوئی یاد نہیں

تجھ سے کب پہلی مُلاقات ہوئی
آخری کب تھی ہوئی یاد نہیں

شور بے ربط صداؤں کا تھا
آگ کِس گھر کو لگی یاد نہیں

جل اُٹھی شمعِ جوانی کِس وقت
اور کب بُجھ بھی گئی یاد نہیں

پوچھنے آئے ہو ، کیسے اُجڑا
پھر کبھی آنا ، ابھی یاد نہیں

تجھ سے بے باک ہُوا جاتا ہوں
مجھ کو اوقات مِری یاد نہیں

دل میں اِک درد اُٹھا تھا آصفؔ
رات پھر کیسے کٹی یاد نہیں

سکوں جس کو سمجھا تھا، مرگِ سکوں ہے
مِرے سامنے پھر وہی بے ستُوں ہے

میں اِک رَزم گاہِ جُنون و خِرد ہوں
کہ بَہلول یاں رُو کشِ افلطوں ہے

کد و کاو ماہِ رہِ صد تمنّا
فراغت چراغِ رہِ اندروں ہے

رُکے جس کا محمل وہ لیلیٰ نہیں ہے
نہیں عِشق جو ہمکنارِ سکُوں ہے

ہم اہلِ زمیں کا ہے قرض اِس پہ آصفؔ
فلک شَرم سے اِس لیے سَر نِگوں ہے

مَہ و انجم کا گزر ہو جانا
بیٹھے بیٹھے وہ سحر ہو جانا

وقتِ رُخصت وہ تھکن لہجے کی
اُس پہ پلکوں کا وہ تر ہو جانا

وہ تِرے ساتھ گھڑی بھر کا سفر
اور پھر گردِ سفر ہو جانا

فُرصتِ آہ میسّر نہ ہوئی
شمع بُجھتے ہی سحر ہو جانا

کب تِری خُو میں تھا اے تیغِ دودم
آلۂ دستِ دِگر ہو جانا

کچھ تو تسکینِ دلِ وحشی ہے
قبر میں خاک بسر ہو جانا

دشت میں قیس کا مرنا آصفؔ
اُس پہ لیلیٰ کو خبر ہو جانا

اِک قیامت ہے تگ ودَو میری
تھرتھراتی ہی نہیں لَو میری

رات نے کھول دیے ہیں گیسو
ہے حَسَد خیز بہت ضَو میری

قبر میں زُعمِ سکوں لایا تھا
بڑھ گئی اور تگا پُو میری

راہ کے کوہِ گراں مثلِ فَساں
نفَسِ تیغ ہوئی رَو میری

مُجھ سے نالاں ہیں سخن ور آصفؔ
ہے پرانی رَوِشِ نَو میری

شوقِ نظّارہ خواب ہو جانا
ہر نظر کا حجاب ہو جانا

اپنا بے باک طُور پر جانا
اور وہیں پر حساب ہو جانا

اِس سے بڑھ کر عذاب کیا ہو گا؟
مُبتلائے ثواب ہو جانا

صُحبتِ بُت میں میرا ہونا ہے
آبِ زَم کا شراب ہو جانا

ہم خرابوں کے حق میں بہتر ہے
بنتے بنتے خراب ہو جانا

اشک ہائے ہزار کا حاصِل
قطرۂ خونِ ناب ہو جانا

سَبَقِ عِشق ، حیرتِ طِفلاں
حرفِ ہر یک کتاب ہو جانا

آرزُوئے فراغِ غم کیا ہے؟
مَوج بن کر حباب ہو جانا

دِلِ مُوسیٰ کی سادگی آصفؔ
محوِ حُسنِ جواب ہو جانا

گِریہ و چشمِ اَشکبار نہ ہو
کوئی مرتا ہے ، اعتبار نہ ہو

ہو بھی منصور اور پھرے چپ چاپ
کوئی مجنوں ہو ، اور خوار نہ ہو

آنکھیں میری ہوں اور سو جائیں
دِل مِرا ، اور بے قرار نہ ہو

زندگی دے اگرچہ دو دن کی
لیکن ایسی کہ دل پہ بار نہ ہو

تا نہ اُمید کی رَسَن ٹُوٹے
وعدہ وہ کر جو پائیدار نہ ہو

مَر کے دم لیں گے، جان بیٹھے ہیں
رُوبرو تیرے آن بیٹھے ہیں

صاحبِ دل نہ ایک بھی نکلا
شہر بھر کو تو چھان بیٹھے ہیں

لُطفِ آئیند و رَفت جاتا رہا
کیوں زمانے کو جان بیٹھے ہیں

اِک زمیں پائے گیر ہے مجھ کو
سر پہ کچھ آسمان بیٹھے ہیں

میرے حق میں جو لوگ ہیں دو چار
بے دہاں، بے زبان بیٹھے ہیں

ہم فِضائے خیال میں صیّاد
اُڑ کے اُونچی اُڑان بیٹھے ہیں

ہم سخن ہے نہ ہم زباں آصفؔ
کِس بیاباں میں آن بیٹھے ہیں

دَرِ کعبہ پہ اکثر سوچتا ہوں
میں اِس جنگل میں کِس کو ڈھونڈتا ہوں

میں اِک ذرّہ سرِ ساحل ہوں لیکن
سمندر کی تَہوں تک دیکھتا ہوں

اِنہی لوگوں سے ہوں میں بھی و لیکن
اِنہی لوگوں سے میں کتنا جُدا ہوں

کہاں تک رونقِ بازار ہویئے؟
میں وہ گُل ہوں جو کانٹا بن گیا ہوں

میں پتھرائی ہوئی آنکھوں سے آصفؔ
بہت آگے کی دُنیا دیکھتا ہوں

خُود کو خُود سے جُدا نہیں کرتا
وہ کسی سے وفا نہیں کرتا

اُس بھلے میں یہی بُرائی ہے
وہ کسی کا بُرا نہیں کرتا

کچھ رِہائی سے ہم بھی ہیں بے زار
یار بھی کچھ رِہا نہیں کرتا

میں بہاروں میں خوش نہیں رہتا
میں خزاں کا گِلہ نہیں کرتا

اِس طرح تو جُدا نہیں کرتے
اِس طرح تو ہُوا نہیں کرتا

دُشمنوں سے ہوں بے نیاز آصفؔ
دوستوں کا گِلہ نہیں کرتا

اِک نیا اِمتحاں ہمارا ہے
پھر اُسی شخص نے پُکارا ہے

غمِ دُنیا ہے، ہجر ہے، میں ہوں
رات ہے، دُھند ہے، ستارا ہے

تیرے لفظوں سے زندگی جاگی
پھر سے کہنا کہ وہ کنارا ہے

وقت یارو وہی ہے ، وقت اپنا
اُس کی گلیوں میں جو گُزارا ہے

گو وہ بولا نہیں مگر آصفؔ
خامُشی بھی تو اِک اِشارا ہے

یہ دِیا صُحبتِ دریا نے مجھے
قید کر رکھا ہے صحرا نے مجھے

اِک نئی رَہ کی طرف موڑ دیا
حیرتِ نقشِ کفِ پا نے مجھے

اِک نئی شرحِ گُنہ بخشی ہے
جُرأتِ دستِ زُلیخا نے مجھے

خواب میں دعوتِ سجدہ دی ہے
سنگِ دہلیزِ کلیسا نے مجھے

مانگ رکھا ہے خدا سے آصفؔ
اِک سُلگتے ہُوئے صحرا نے مجھے

اِس قیامت نے بپا ہونا ہے
ہمیں اِک روز جُدا ہونا ہے

رنگ و بُو کا جو سمندر ہے رواں
اس سمندر کو ہوا ہونا ہے

جو اَنا مانعِ سجدہ ہے ابھی
اُس اَنا نے بھی خُدا ہونا ہے

ابھی وہ آنکھ ہُوئی ہے برہم
ابھی دُنیا نے خفا ہونا ہے

ابھی تو خیمہ لگا ہے آصفؔ
دشت نے دشتِ بلا ہونا ہے

مُسکرا کر جو چلا جاتا ہے
اِک دِیا اور جلا جاتا ہے

اُس نے دستک بھی نہیں دی لیکن
دِل کا دروازہ کُھلا جاتا ہے

اُس کی ٹھوڑی سے ٹپکتا آنسو
دل پہ اِک شُعلہ گِرا جاتا ہے

اب وہ پہلے سے نہیں رنگ مِرے
جانے کیا مجھ کو ہُوا جاتا ہے؟

دِل کی تختی پہ کوئی نام آصفؔ
ایک ہی بار لکھا جاتا ہے

بہت مجبور ہوتا جا رہا ہوں
میں تُم سے دُور ہوتا جا رہا ہوں

رَہِ اُلفت میں پہلے ہی قدم پہ
تھکن سے چُور ہوتا جا رہا ہوں

کہیں مجنوں غُبارِ سر بسر ہوں
کہیں منصور ہوتا جا رہا ہوں

کہیں گُمنام ہوں عَنقا کی صورت
کہیں مشہور ہوتا جا رہا ہوں

میں اُس کے نام کی نسبت پہ آصفؔ
بہت مغرور ہوتا جا رہا ہوں

فتیلہ راکھ کر دے آرزُو کا
چراغِ رہ بجھادے جُستجو کا

وہی ہے مُبتلائے تشنہ کامی
نہیں پابند جو جام و سبُو کا

وہی رونا حبابِ بحر کا ہے
وہی رونا حبابِ آبجو کا

پئے شیریں ہے جوئے شِیر خُسرو!
اور اپنے واسطے دریا لہو کا

چراغِ بزم آزُردہ ہوں آصف
سحر ہے مُعجزہ میرے لہو کا

مجھ سے چرخِ بلند ہے گویا
نالہ تیرا کمند ہے گویا

دستِ جمہور کی کلہ بندی
بر سرِ گوسفند ہے گویا

جُز خرابی نہیں مداوا کوئی
دِل یہ محشر پسند ہے گویا

جُز ہلاہل نہیں ہے قندِ کُہن
زہرِ نَو ہم کو قند ہے گویا

بحرِ دوراں میں زندگی آصفؔ
مُوسٰیؑ تابوت بند ہے گویا

وسعتِ دشت میں آزاد رہی
حسرتِ نالہ کشی شاد رہی

موت کو اِس کے بجُز کیا کہیے؟
ایک حسرت ، کہ جو بے داد رہی

مجھ کو دُنیا سے یہی شِکوہ ہے
یہ ترے بعد بھی آباد رہی

فتنۂ شورِ قیامت میں بھی
تیری رُخصت کی گھڑی یاد رہی

کیا خلِش تھی دلِ لیلیٰ میں؟ کہ وہ
صُحبتِ قیس میں ناشاد رہی

حُسنِ عالم ہے اُسی سے آصفؔ
اِک کمی جو دمِ ایجاد رہی

تُو نے جس دن سے حجاب اپنا اُٹھا رکھا ہے
کتنی آنکھیں ہیں جنہیں تُو نے جگا رکھا ہے

ایک ہی ضرب سے تیشے کی مَرا، کیا جانے؟
کُند خنجر سے مزا ہم نے جو پا رکھا ہے

کوئی طوفاں سے کہے اِس کو بَجھا کر جائے
اِک دِیا ہم نے بھی دیوار پہ لا رکھا ہے

روز کے وصل سے اُکتا کے پئے لذّتِ ہجر
دَیر سے ہم نے اُسے عرش پہ جا رکھا ہے

مانع آتی تھی اَنا، شوقِ بُتاں کے آصفؔ
دِل کے کعبے کو سو اب دَیر بنا رکھا ہے

لَوٹ سکتا ہوں ، اِرادہ بھی بدل سکتا ہوں
تیری آواز کے شُعلے سے پِگھل سکتا ہوں

عشق میں بھی ہوں رہ ورسمِ جہاں سے آزاد
میں تجھے کھو کے مِری جان سَنبھل سکتا ہوں

اپنی آنکھوں کی نمی پر ہے تصرّف میرا
اپنے دریا کو میں صحرا میں بدل سکتا ہوں

پا بہ زنجیر ہوں ، ہاتھوں کو مگر ہے فُرصت
بیٹھے بیٹھے کفِ افسوس تو مَل سکتا ہوں

جسم ہے چور مگر دل کہ سراپا سیماب
بیٹھ سکتا ہوں کہیں اور نہ چل سکتا ہوں

کون ناموُسِ محبت کو رِدا بخشے گا
میں بھی اِن جلتے ہوئے خیموں میں جل سکتا ہوں

لذّتِ کشمکشِ زیست اِسی میں ہے نِہاں
حلقۂ شام و سحر سے تو نکل سکتا ہوں

وہی محفل ، وہی صُحبت جو ملے تو آصفؔ
اب بھی چنچل ہوں ، اُسی طرح مچل سکتا ہوں

اپنی مجنوں سی کہانی کیوں ہو ؟
دشت کی نذر جوانی کیوں ہو ؟

قُلزمِ دِل سے اگر فیض ملے
خون ہو آنکھ میں ، پانی کیوں ہو؟

خوں اگر مُوئے قلم سے ٹپکے
کوئی تصویر پُرانی کیوں ہو ؟

راکھ ہی ہونا ہے گر دُنیا کو
ہر طرف آگ ہو، پانی کیوں ہو؟

کیوں مِرے دل میں بسیرا ہے تِرا
لا مکانی ہو، مکانی کیوں ہو؟

دوست اُس جیسا ملا ہے آصفؔ
اب کوئی دُشمنِ جانی کیوں ہو؟

غُبارِ دشتِ جنوں بے قرار ہے اب کے
ہمارے سر پہ بھی وحشت سوار ہے اب کے

فصیلِ شہر پہ کل رات لکھ رہا تھا کوئی
یہاں تو لمحہ بھی صدیوں پہ بار ہے اب کے

قرار مِل گیا یا بے قرار جاتے رہے
ہجومِ عام، نہ مجرم، نہ دار ہے اب کے

یہی وہ دن تھے، جلا تھا کسی کا خیمہ یہاں
اُسی کے سوگ میں دریا غُبار ہے اب کے

جلا کے آئے ہیں ہم بھی تو اِک خیاباں کو
فصیلِ یار اگر سایہ دار ہے اب کے

نگاہ شوخ نہ وہ بے قرار دل آصفؔ
فضائے بزمِ طلب سوگوار ہے اب کے

وہ دن جو تیری گلی میں گُزارا کرتے تھے
ہم ایک ایک نظر کو گوارا کرتے تھے

شرارتوں کے وہ موسم عجیب تھے ہمدم
نظر بچا کے لبوں سے اِشارا کرتے تھے

شبِ فراق کی اب خُونی اُنگلیوں میں ہیں
وہ بال جن کو کبھی تم سنوارا کرتے تھے

میں ریت اوڑھ کے سوتا تو میرے گھر والے
سُلگتے دشت میں نیزے اُتارا کرتے تھے

جلی ہوئی تھی وہ اِک چوب اپنے خیمے کی
کبھی کبھی جِسے دریا پہ مارا کرتے تھے

وہی خُدا تو نہیں آج رُوبرو آصفؔ
غموں کی بھیڑ میں جس کو پُکارا کرتے تھے

موت کو اپنی جہاں دیکھیں گے
محملِ لیلائے جاں دیکھیں گے

دیکھنا ہم ہی سرِ طُور اِک دن
صورتِ ''وہم و گماں'' دیکھیں گے

اب وہ پہلی سی سہولت کب ہے
اب تجھے روز کہاں دیکھیں گے

ہم ترِے بعد اِنھی رستوں میں
تیرے قدموں کے نشاں دیکھیں گے

وقت نے یہ بھی دِکھانا تھا ہمیں
دُور سے تیرا مکاں دیکھیں گے

ہاں تو اے سُوکھی ہوئی نہرِ حیات
کب تجھے ہم بھی رواں دیکھیں گے

خشک دریا کے کنارے آصفؔ
جلتے خیمے کا دُھواں دیکھیں گے

ذرّہ ذرّہ سوال ہے صحرا
ایک آنسو جواب ہے میرا

ہے مِری چُپ برہنگی میری
لب کُشائی حجاب ہے میرا

گاہ ہوتا ہے گہ نہیں ہوتا
دل بھی گویا حباب ہے میرا

ہم پیالہ ہے خود شراب مِری
دردِ سر ہم رکاب ہے میرا

صاحبِ صُور سے کوئی کہہ دے
تیرے ہاتھوں میں خواب ہے میرا

شبِ عاشور ہے یہ عہد آصفؔ
خیمہ بے آفتاب ہے میرا

تنگ تھا ظرفِ نظر پہلوئے لیلیٰ میں تھے جب
دشت میں آنکھ کھلی تازہ جہاں پیدا ہوا

دشتِ اُلفت میں مِرا شوق ہے آگے مجھ سے
پاؤں رکھنے سے مرے پہلے نشاں پیدا ہوا

ایک قطرہ تھا سرِ مژگاں بہت سہما ہوا
پھر اُسی قطرے سے اِک بحرِ رواں پیدا ہوا

ایک قطرے سے تراشا ہے سمندر کا غرور
ایک ذرّے سے مِرے کوہِ گراں پیدا ہوا

گُنبدِ دل میں اِک آواز کبھی گونجی تھی
جب وہ خاموش ہوئی حُسنِ زباں پیدا ہوا

یہ تو وہ شخص نہیں ، یہ تو کوئی اور ہی ہے
عمر کے آدھے سفر پہ یہ گماں پیدا ہوا

اُس کی غفلت پہ بہت ہے یہی حُجت آصفؔ
آگ جلنے سے بہت پہلے دُھواں پیدا ہوا

دائرہ در دائرہ ہے زندگی
مُشکلوں کا سلسلہ ہے زندگی

کون سے حُسنِ عمل کی ہے جزا
کِن گناہوں کی سزا ہے زندگی

کس قدر ہے مختصر یہ دشت بھی !
دل مِرا اُکتا گیا ہے زندگی!

بس اِسی کے سوز سے ہم تم بھی تھے
یہ دِیا جو اب بُجھا ہے زندگی!

آ رہا ہوں موت سے مل کر تو میں
رنگ تیرا کیوں اُڑا ہے زندگی

موت اِک خورشیدِ عالم تاب ہے
ایک آوارہ گھٹا ہے زندگی

نیم جاں، خنجر تلے، آصفؔ سے پوچھ
موت کیا ہے اور کیا ہے زندگی

زندگی دشتِ بے جنوں کب ہے؟
دل کو بھی حسرتِ سکوں کب ہے ؟

آتشیں ہے ، کبھی ہے غرقِ غُبار
آسماں میرا نیلگوں کب ہے ؟

موت کہتے ہیں آپ لوگ جسے
موت تو ہے مگر وہ یوں کب ہے ؟

کر تو لیں بندگی شعار مگر
یہ پیالہ بھی واژگوں کب ہے؟

دی جو آصفؔ جنازے کی اطلاع
اُس نے کچھ یوں کہا کہ ''ہوں'' کب ہے؟

کیا کہوں؟

اِسے نعمت کہوں
عذاب کہوں؟
میں وہ گُل ہوں
جو کھِلا بھی
تو قحط سالی میں

میں، اُمید اور زندگی

میں ساربان شکستہ
وہ ٹوٹی ہوئی نکیل
اور ناقۂ حیات کے
پاؤں کٹے ہوئے

ڈیموکریٹس

(ایک یونانی فلاسفر)

میں، مِرا باپ، مِرے باپ کا باپ
ایک ہی لمحے میں
ہم پیدا ہوئے
اور اُسی لمحے میں ہم
مر بھی گئے

وقت بہتا ہوا دریا ہے اِک
اور میں کیا ہوں؟
بجُز سنگِ حریف
شورِ لَطمہ ہے زمانہ میرا
اور جو کچھ ہے فسانہ تیرا

ایک ہی لمحے میں ہم مر بھی گئے
اور اُسی لمحے میں ہم پیدا ہوئے

نظریۂ شر کے جواب میں

جانتا ہوں کہ بزمِ ہستی میں
گرمیٔ شوق بے رقیب نہیں

خیر منّت کشِ بلیس کہاں ؟
کوئی سمجھے تو کچھ عجیب نہیں

جُستجوئے کمال بھی ہے یہاں
یہ جنوں بھی کم از رقیب نہیں

خیمۂ اِمروز

فکرِ فردا ہاتھ میں شُعلے لیے
خیمۂ اِمروز کو
سُلگا رہی ہے
دجلۂ ماضی کی اِک بے تاب موج
فرشِ ساحل پر
تڑپ کے مر گئی ہے

تُو نے جو کہا تھا

وقتِ رُخصت جو کہا تھا تُو نے
''یوں نہیں،
مُسکرا کے جانا ہے''
بس مِری جان وہی آخری بار
جیسے تیسے بھی مُسکرایا تھا

مرے خیال نے اُس کو جگا دیا ہوگا

اُفق کی مانگ میں سِندور بھر چکا سورج
لبِ اُفق سے ستارے کی روشنی اُبھری
طناب کھنچ گئی یک بار خیمۂ شب کی
قمر کی قاش سے صحرا میں چاندنی بکھری

غُبار دشت کی پلکوں پہ رکھ کے نیند کا بوجھ
ہوا نے وحشتِ صحرا کو محوِ خواب کیا
شرارِ کرمکِ شب کو ذرا سا بھڑکا کر
گلاب شُعلوں کو مائل بہ التہاب کیا

مجھے خیال یہ گُزرا کہ اب اِسی لمحے
وہ اپنے صحن کی جنّت میں سو رہی ہوگی
وہ اپنے سُرمئی آنچل کی گرم خُوشبو میں
خیال وخواب کی وادی میں کھو رہی ہوگی

ہوا نے چہرے سے آنچل ہٹا دیا ہوگا
مِرے خیال نے اُس کو جگا دیا ہوگا

خیال ہوتا ہے ایک دُنیا

کوئی اگر مجھ کو پھول سمجھے
تو پھول بن کر دِکھا دوں اُس کو
کوئی اگر مجھ کو کانٹا سمجھے
تو اِس طرح سے چُبھوں میں اُس کو
(کہ پنبۂ مرہم کی مانند)
میں آبلوں سُلا کے رکھ دُوں
جلن کے شعلے بجھا کے رکھ دُوں
کہیں سرِ راہ چلتے چلتے
میں نقشِ پا کی مثال
محرابِ پا سے اُتروں

اُسے گُماں تک نہ ہو کہ جس کو
وہ خار کہنا تھا، پیار بن کر
رگوں میں اُس کی اُتر گیا ہے
وہ کانٹا اُس کے ہی نقشِ پا پر
جما کے رُخسار سو گیا ہے
خیال ہوتا ہے ایک دُنیا
ہمارے بس میں کہاں ہے ہمدم
کسی کی دُنیا اُجاڑ دینا
خیال ہوتا ہے ایک دُنیا

خواب در خواب

خواب پورا ابھی ہوا تو
اِس طرح
گھر میں وہ آیا تھا
اور میں سو رہا تھا

نہج البلاغہ سے ایک فرمان

مطلعِ زندگی
مشقّت ہے
مقطعِ زندگی
ہلاکت ہے

ایک مُدّت کے بعد

"تم !"

"ہاں......

میں"

محبتوں میں غرور کیسا؟

محبتوں میں غرور کیسا؟
اَنا کا اندھا سرور کیسا؟
اگر کبھی میں
شریر جھونکا ہوا کا بن کر
تِری اَنا کے
چراغ کی لَو کو
تھرتھراؤں تو لَوٹ آنا
میں یاد آؤں تو لَوٹ آنا
نئی نئی ہے لڑائی اپنی
نئی نئی ہے جُدائی اپنی
تمہاری یادوں کی سیر گہ میں
جو گنگناؤں تو لَوٹ آنا
میں یاد آؤں تو لَوٹ آنا
طویل راہیں ہیں زندگی کی
یہ ایک لمحے میں طے نہ ہوں گی
طویل شامیں ہیں ہجر کی بھی
یہ ایک پل میں کہاں کٹیں گی؟

اُداس لمحوں میں اَشک بن کر
تمہاری پلکوں پہ
جھلملاؤں تو لوٹ آنا
میں یاد آؤں تو لوٹ آنا
میں ایک سیماب سی تمنّا
جو بن کہے
تیرے دل میں اِک آگ سی لگا دوں
میں نیند بن کر
(اِن ادھ کھلی آنکھوں کو چُھو کر)
تمہیں سُلا کر
بہ موجۂ خواب پھر جگاؤں تو لوٹ آنا
میں یاد آؤں تو لوٹ آنا
سُنو!
میں مر بھی جاؤں تو لوٹ آنا
کہ میرے گھر کی ہر ایک شے میں
رَچی بَسی ہے تُمہاری خُوشبو
وہ میرے گھر میں اُگے ہوئے
اِک شجر کو تُو نے چُھوا تھا اِک دن
اُسی شجر کے تمام پتّے

تُمہاری فُرقت میں رو رہے ہیں
جو پھول تُو نے دیے تھے مجھ کو
مِری کتابوں میں سو رہے ہیں
تُم آ کے دیکھو کہ
میری ٹیبل کے
ہر وَرَق پر ہیں تیری باتیں
وہ ڈائری کا
ہر ایک صفحہ
تُمہاری تصویر بن چُکا ہے
یہ جس قدر بھی حکائتیں ہیں
یہ سب تمہاری امانتیں ہیں
میں مرتے مرتے جو
لب ہِلاؤں تو لوٹ آنا
کہ میرا کیا ہے؟
یہ سب تِرا ہے
میں مر بھی جاؤں تو لوٹ آنا
محبتوں میں غرور کیسا؟

میری اُمید ہو ، سہارا ہو
دُھند کی لہر پر ستارہ ہو

تیرے آنچل کو اوڑھ کر سو جاؤں
رات ہو ، جھیل کا کنارا ہو

کاش برزخ ہو یار کی آغوش
حشر سانسوں کا اِک شرارہ ہو

خُلد سُنتے ہیں ہم جسے ، اے کاش!
اِک علامت ہو ، استعارہ ہو

اُس نے دیکھا ہو بھیڑ میں شاید
اُس نے شاید مجھے پکارا ہو

ایسا لگتا ہے ، کیوں مگر آصفؔ
جیسے وہ آج بھی ہمارا ہو

جاؤ ہم بولتے نہیں تم سے

ایک مُدّت سے میری خواہش ہے
روٹھ لوں میں بھی ایک دن تم سے
تم بہت دیر تک یونہی چُپ چاپ
ایک دم آنکھ بھر کے دیکھو مجھے
اور پاس آ کے یہ کہو
''دیکھو!
ایسی بھی کیا کہ یہ یوں بگڑ بیٹھے؟
اچھا پچھلی خطا سے توبہ ہے
پھر دُکھاؤں جو دل تو میں کافِر''

پر کبھی اِس طرح نہیں ہوگا
کہ کبھی ہم بھی کہہ سکیں تم سے
جاؤ ہم بولتے نہیں تم سے
جاؤ ہم بولتے نہیں تم سے

قطعہ

رمزِ توحید کے گرداب میں تھا نُوحِ گماں
تیرا سجادۂ ریگ اِبنِ علیؑ کام آیا
کِشتِ رے ، دستِ زُلیخائی و دربارِ یزید
ہر جگہ تیرا ہی اندازِ نفی کام آیا

قطعہ

حاتم ہے وہ سخی کہ جو در پر بُلا کے دے
حیدرؑ ہے وہ کریم ، نہ جاؤ تو آ کے دے
آصفؔ مِرا علیؑ وہ شہِ ممکنات ہے
سورج پہ گھر جو برف کا مانگوں ، بنا کے دے

سلام

کوثر سے ہے عظیم یہ آنکھ، اِس دلیل سے
مولاؑ ہوئے ہیں سَیر اِسی سلسبیل سے

اے نورِ اہلِ بیتِ محمد ! ہے درد کیا ؟
یاقوت جو اُچھلتے ہیں آنکھوں کے نیل سے

شبیرؑ لے چلے ہیں یوں اصغرؑ کو گود سے
جیسے کنول کسی نے اُٹھایا ہو جھیل سے

قطرے سے آئی ہے کہیں دریاؤں میں کمی؟
پالا پڑا ہے آکے تِرا کس بخیل سے

بد بخت بھی حُسینؑ سے لَوٹا نہ بے مُراد
قاتل دُعائیں لیتے رہے اُس قتیل سے

○ امام زین العابدینؑ

آخری آرام گاہ

گونج اُٹھی شہرِ خموشاں
کی فضا
اِس قدر زوروں سے میں
ہنستا رہا
واقعہ یوں ہے
کہ اِک کتبے پہ واں
(انتہائی سادگی سے)
ایک فرسُودہ سا
جملہ تھا لکھا
آخری آرام گاہ

اُس نے ہر بار مجھے خط میں یہی لکھا ہے

اُس نے ہر بار مجھے خط میں یہی لکھا ہے
تجھ سا سنگدل بھی، زمانے میں نہ پیدا ہوگا
کون کہتا ہے تجھے
ٹوٹ کے چاہو مجھ کو؟
کون کہتا ہے کہ
میرے ہی خیالوں میں رہو؟
اِک ذرا سا لبِ اِظہار بھی وا ہوتا نہیں؟
نہ کہو مُنہ سے
اِشارے سے تو کہہ سکتے ہو
اُس نے ہر بار مجھے خط میں یہی لکھا ہے

اُس نے ہر بار مجھے خط میں یہی لکھا ہے
تجھ سے وابستہ ہر اِک شے سے محبت ہے مجھے
وہ کوئی رنگ ہو............
خوشبو ہو............

یا کتاب کوئی
گرمیوں کی ہوں دوپہریں
کہ سُرمئی شامیں
دُھوپ پھاگن کی ہو، یا چیت کا مہتاب کوئی
اُس نے ہر بار مجھے خط میں یہی لکھا ہے

اُس نے ہر بار مجھے خط میں یہی لکھا ہے
تم یہاں اِس لیے آتے ہو کہ ہم چاہتے ہیں
اِس لیے تم نہیں آتے
کہ تم بھی چاہتے ہو
میرا دل رکھنے چلے آتے ہو ہر بار یہاں
مجھ سے بڑھ کر بھی
بھلا کوئی تمھیں جانے گا
کھیل اب ختم کرو، عین اِسی وقت کہو

جھٹ سے ہاں کہہ دو مجھے
اور یا پھر
ناں کہہ دو
اُس نے ہر بار مجھے خط میں یہی لکھا ہے

اُس نے ہر بار مجھے خط میں یہی لکھا ہے
اب مِرے سامنے آنے کی
نہ کوشش کرنا
میں نے مشکل سے سمیٹی ہیں
کِرچیاں اپنی
بڑی مشکل سے ہوئی ہیں
مِری باہیں رنگیں
پھر نہیں توڑنی مجھ کو
یہ چوڑیاں اپنی
تم نے کیا مجھ کو تماشا سا بنا رکھا ہے
اُس نے ہر بار مجھے خط میں یہی لکھا ہے

اُس نے ہر بار مجھے خط میں یہی لکھا ہے

گوئٹے کا نظریۂ رُوح

رُوح بے تاب، ازل سے بے تاب
جاوِداں سیلِ حیات اِس سے ہوا
کارواں دُھول ہوئے، خاک ہوئے
نقشِ ہر شوق ثبات اِس سے ہوا

مِثلِ خورشید رواں رہتی ہے
اِک جہاں میں یہ کہاں رہتی ہے

جسم ہے مثلِ شفق گردِ سفر
گرد......اجزا کا ہے یک جاں ہونا
موت کا کام پریشاں کرنا
گرد کا کام ...... پریشاں ہونا

رُوح اِس کھیل کے مابین کہاں !
رُوح کو موت کہاں ، چین کہاں ؟

شوپن ہار اور اِشترا کی یُوٹوپیا

کیا اِشترا کیوں کو خبر، کیا ہے زندگی ؟
اِس درد کا علاج میسّر نہیں یہاں
جنت بھی اِک عذاب ہے اِبلیس کے بغیر
اِس کی نہ شُعلگی ہو تو برفاب ہے جہاں
بڑھ کر طویل نکلے گی آخر وہ رات بھی
یعنی کہ ایک غم ہے ، غموں سے نجات بھی

کہاں ہے ایسی نگہ دِل کو جو اسیر کرے
مِرے جنوں کو کمیں اور خِرد کو تیر کرے

تُم ایسی خُلد کے واعظ ! ہو بیٹھے ہو عاشق
پئے وصال جو مرنے کو ناگزیر کرے

جہاں میں ایسی زلیخا ہوئی نہیں پیدا
مِرے ضمیر کے یوسفؑ کو جو اسیر کرے

خضرؑ کی عمر کو پہنچے گا آدمِ جمہور
کہ اِس کی گِل کوئی آمر اگر خمیر کرے

علیؑ کا عشق خطِ مستقیم ہے ہمدم
اِسی لکیر کا حق تجھ کو بھی فقیر کرے

مسلسل کچھ دِنوں سے رو رہے ہیں
پُرانے داغ تھے ، اب دھو رہے ہیں

ہُوئے جاتے ہیں گردِ پائے دَوراں
حقیقت تھے ، فسانہ ہو رہے ہیں

بہت ناراض تھے، بچھڑے تھے جب ہم
مِلے ہیں تو لِپٹ کر رو رہے ہیں

پگھلتے جا رہے ہیں قطرہ قطرہ
تمہیں ہم لمحہ لمحہ کھو رہے ہیں

نہ سرکاؤ ابھی چہرے سے پردہ
بہت جاگے ہیں، اب ہم سو رہے ہیں

روانہ ہو چکا ہے چاند آصفؔ
جو اِک دو تھے ستارے، کھو رہے ہیں

وجودیت

شکایت میں بھی
اِک طُرفہ مزا ہے
نہیں بھی ہے
تو کہیے کہ
خُدا ہے

امام حسین علیہ السّلام

لوگ پابندِ طور سمجھے تھے
وہ جہاں بھی گیا کلیم ہی تھا

بعدِ عباسؑ کچھ نہ تھا اور وہ
ایسے عالم میں بھی کریم ہی تھا

گر نہ ہوتا حسینؑ سا آقا
باپ رکھ کر بھی میں یتیم ہی تھا

خیر وہ، وہ ہے، اُسے حق ہے، وہ سو بار کرے
غیر کو حق یہ دِیا کس نے کہ تکرار کرے

کیا کہیں اُس کو جو کہہ کر یہ کہے، کب ہے کہا ؟
کیا کرے اُس کا کوئی مُنہ پہ جو اِنکار کرے

تُو نے جز اپنے کِسی اور کو چاہا ہی نہیں
کیا خبر تجھ کو ، خدا تجھ کو طلب گار کرے

میں کسی ایسے سرافیلؑ کا ہوں متلاشی
کہ شبستانِ تمنا سے جو بیدار کرے

جاؤ ہم لائقِ سجدہ نہیں کہنے والے
نیل کو اُڑ کے بھی فرعون اگر پار کرے

ہیں محبت میں بھی مغرور بلا کے آصف
جس پہ مرتے ہیں وہی آئے اور اِظہار کرے

غمِ تخریب سے دو چار رہا
کوئی جب تک بھی پائیدار رہا

جامۂ زندگی کے کام آیا ہے
دِل جو سینے میں تار تار رہا

منزلیں ڈھونڈتی پھریں گی مجھے
میں اگر یونہی بے قرار رہا

لیجئیے آ گئی وہ موت آخر
عمر بھر جس کا اِنتظار رہا

محرمِ راز کیوں نہ ہوں آصفؔ
میں جوانی میں سوگوار رہا

نوعمر مسافر

خوف اتنا ہے
اِس اندھیرے میں
کوئی جگنو بھی اگر چمکے
تو ڈر جاتا ہوں